ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.3 2023

ماضی اور مستقبل کے سنگم پر شاہکار ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کا تہذیبی و ثقافتی مطالعہ

Civilization and cultural study of the masterpiece novel "Kai Chandthesar-i Asmaan" on the junction of past and future

عظمیٰ عصمت
ایم فل اسکالر، لاہور لیڈز یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر محمد عطااللہ
صدرِ شعبہ اردو، لاہور لیڈز یونیورسٹی، لاہور
سمسون مسیح
ایم فل اسکالر، لاہور لیڈز یونیورسٹی، لاہور

Abstract

Shamsur Rahman Farooqui is known as a well-known poet, writer, critic, teacher, intellectual, translator and journalist in the literary world. He is a resident of Ria Par, Azamgarh district (now Mayo district). He was born on 30 September 1935. Kala Kankar House took place in Pratapgarh (UP).

Shamsur Rahman Farooqui's novel "Kai Chand Thaye Sar-e Asmaan" presents pictures of civilization and culture disappearing in the late eighteenth and nineteenth centuries, while in Dr. Ahsan Farooqui's novel "Sham-i Oudh" the cultural traditions of Lucknow, especially Oudh, are presented. The last period of the decline of traditions is described. Overall, both novels seem to present the historical and cultural decline of the last period of Indo-Islamic civilization and culture.

Key Words: Civilization, Decline of traditions, Novel, Pictures of civilization

ناول ایسی صنفِ ادب ہے جس میں کسی معاشرے کے سیاسی، سماجی، معاشرتی اور مذہبی زاویوں کے ساتھ ساتھ فکری و علمی رویے بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ چونکہ ناول میں کسی بھی معاشرے کے مجموعی رویوں اور ان کو متاثر کرنے والے عوامل کو پیش کیا جاتا ہے اس لیے یہ مجموعی طور پر زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی عہد کی تاریخ اور تہذیب کے بارے میں تفصیلی مطالعے اور تجزیے کے لیے اس دور میں لکھے جانے والے ناول بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ناول کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ میں بے شمار ناول لکھے جا چکے ہین جن میں سے کچھ ناول ایسے ہیں جو تاریک پر مبنی ہیں جبکہ کچھ ایسے بھی ہیں جن میں تہذیب پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ لیکن اردو ناول نگاری میں چند ایسے ناول بھی لکھے گئے ہین جن میں تاریخی و تہذیبی جھلکیاں ایک ساتھ نظر آتی ہیں۔ ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' ہند اسلامی تہذیب و ثقافت اور تاریک کے زوال پذیر عہد کی مٹتی ہوئی تصویریں پیش کی ہیں۔ مذکورہ ناول میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کی مائل بہ زوال تاریخ اور تہذیب کو اس عمدگی اور مہارت سے پیش کیا گیا ہے کہ ناول کے مطالعہ کے دوران اس عہد کی مکمل تصویریں نظروں میں ابھرنے لگتی ہیں۔ شمس الرّحمٰن فاروقی نے اپنے ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کو تاریخی ناول قرار دینے کے منافی ہیں اور اسے ایک مخصوص عہد کی تہذیب و ثقافت اور معاشرے کے انسانی رویّوں کا بیانیہ قرار دیتے ہیں۔

> ''اسے اٹھارویں، اُنیسویں صدی کی ہند اسلامی تہذیب اور انسانی تہذیبی وادبی سروکاروں کا مرقع سمجھ کر پڑھا جائے تو بہتر ہوگا''(1)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.3 2023

اس ناول میں مغلیہ عہد کے زوال اور تہذیب وثقافت کی مٹتی ہوئی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ جہاں ایک طرف غیر ملکی حاکم بن بیٹھے تھے تودوسری صدیوں پرانی تہذیب بھی زوال کی راہ پر گامزن ہوچکی تھی۔ناول نگارنے اس ناول میں اس عہد کی روایات، زبان، آداب، محل کی سازشیں، ثقافت، مذہب غرض باریک اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کواس فنکاری سے بیان کیاہے کہ اس عہد کی ڈوبتی اور مٹتی ہوئی تہذیب وثقافت کی تصویر اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ ناول تاریخ اور فکشن کاخوبصورت امتزاج ہے۔ نجس میں مرزاغالب، غلام ہمدانی مصحفی جیسی ادبی شخصیات کو مرکز میں رکھ کراٹھارویں اور اُنیسویں صدی کے ہندوستان کی ادبی اور تہذیبی صورتحال کوایسی ہنرمندی اور مہارت سے پیش کیاگیاہے کہ اس عہد کی ادبی وتہذیبی روایات کی مکمل عکاسی کی گئی ہے۔اس مثلاً محرم کی مجالس کااحوال، شاعری اور موسیقی کی محفلیں، اُردو فارسی زبان کی نزاکتیں، دربار اور محلات کی سازشیں، شکار، خاصہ تناول کرنے کے طریقے، امام ضامن باندھنا، ٹھگوں کی کارستانیاں اور دیوانِ حافظ سے فال نکالنا کے علاوہ اس عہد کی اشیاء کے نام بھی اسی زبان میں بیان کیے ہیں جو اس زمانے میں ان اشیاء کے نام تھے۔اور اس عہد کے معاشرتی رویّوں، حقیقتوں، سروکاروں، مقاصد، اخلاقیات، معاشرتی اقدار، تصورات وغیرہ کو پیش کرنے کے لیے ایک تاریخی کردار وزیر بیگم کاانتخاب کیاگیاہے۔اس طرح یہ ناول اس زمانے کی سماجی تشکیل اور معاشرتی تشخیص کے ساتھ ساتھ تمدنی اظہار، طبقاتی ترجیحات تہذیبی مزاج اور اجتماعی حیثیت کے علاوہ اس کردار کے ذریعے ناول نگارنے اس بکھرتی، دم توڑتی اور ڈوبتی ہوئی تہذیب کاالمیہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ جس کاآغاز اُنیسویں صدی سے ہوتاہے۔اس صدی کی ساتویں دہائی تک نوابوں کے رہن سہن اور ان کے لباس کی تراش خراش، تہذیبی رکھ رکھاؤ اور شاعروں کی محفل میں شعراء کااحترام ومرتبہ ، ہندؤوں اور مسلمانوں کے تہواروں پر منائی جانے والی رسوم، انواع واقسام کے کھانے، نوابوں کے حرم سراؤں میں کام کرنے والی خادماؤں یعنی کنیزوں کے تنازعات میں وکیلوں کے کردار، مولویوں کاطرزِ عمل، گھروں میں بیٹھی اللہ والیوں سے مستقبل کے بارے میں رجوع کرنا اور ان کی باتوں پر آنکھیں بند کر کے یقین کرلینا اور، جوتشیوں سے زائچے بنواکر آنکھیں بند کر کے یقین اور عمل پیرا ہو جانا بھی اسی عہد کی ایک مثال ہے۔ چاہے وہ زائچہ اُلٹ ہی کام کیوں نہ کرے، لیکن یقین پختہ ہوتا تھا۔

> ''پنڈت جی مسکرائے ''اچھا کسی پھول کانام لیجئیے''انھوں نے کہا۔۔''جوہی'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔پنڈت نند کشور نے آنکھیں بند کرلیں، تسبیح کے کچھ دانے شمار کیے، پھر ایک پل بعد بولے:
>
> ''دہلی کے شمال مغرب میں، یہاں سے بہت دور بھی نہیں، نوابی ریاست ہے۔والیٔ ریاست کانام۔۔''انھوں نے چند لمحے توقف کیا''۔۔شمس الدین احمد ہے۔وزیر کاچہرہ شرم سے گلابی ہوگیا، وہ سرجھکائے بولی: سرکار کے لیے عیاں راچہ بیاں؟ لیکن مراجی بہت ڈرتاہے کہ۔۔۔''.(2)

مخصوص نوابی معاشرت کانقشہ، جوعام معاشرے سے بالکل الگ تھلگ معاشرہ دکھائی دیتاہے۔اور اس معاشرے کی جھلک کے دوران دلی کے عام گلی اور کوچوں میں زندگی بسر کرنے والوں کی جھلکیاں کم کم نظر آتی ہیں۔اس عہد میں نوابوں کے دیوان خانے خاص انداز میں سجائے اور سنوارے جاتے تھے جو مخصوص اور بہت ہی خاص مہمانوں سے ملاقاتی مقام تھا۔جس کی آرائش وزیبائش کاخاص خیال رکھاجاتاتھا۔ نواب کے دیوان خانے کی ایک جھلک ناول نگارنے کس خوبصورت انداز میں پیش کی ہے، جیسے وہ اس منظر کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کرآئے ہیں:

> ''دیوان خانے میں داخل ہوتے ہی معلوم ہوتا تھا کہ ہم انگریزی طرزِ تعمیر، وضع قطع، طریقۂ بودوباش سب کچھ باہر ہی چھوڑ آئے ہیں۔پہلی بات تو یہ کہ صدر دروازہ 'جوخود محراب نما تھا' ایک اور محرابی دروازے پر کُھلتا تھا۔گنبدی محراب کے اندر بناہوا یہ دروازہ ہر معنٰی میں تاجدار دروازہ کہے جانے کا مستحق تھا۔اس دروازے کے شاگرد 'سنگ پائے زر' کے تھے۔اس کی دیوار اور خود اس دروازے کے دونوں پٹ مغل طرز کے کام سے پٹے ہوئے تھے۔دونوں کواڑ ایک ہی تختہ تراش کر بنائے گئے تھے۔ان میں بنی یا پُشتی دان کچھ بھی نہ تھا۔سب کچھ منقش تھا اور نقش ونگار میں ہرے، زبرجدی، سنہرے اور سفید رنگ کی اس قدر کثرت تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ دروازہ اور دیوار بلکہ ایک ڈال کانگینہ ہے، جس میں کسی حیرت انگیز قدرتی معجزے کے باعث یہ سارے رنگ سماگئے ہیں۔دروازہ کہنے کو تو صندل اور شیشم کی لکڑی کا تھا۔لیکن اس ہاتھی دانت کے ہلکے چوکور ٹکڑوں کو کھپرے کی طرح بناکر دروازے کے پلوں پر چپکایا گیا تھا اور ہاتھی دانت کی ان کھپریلوں کو بھی اسی طرح

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.3 2023

کے نقش و نگار سے بھر دیا گیا تھا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ کھپریل بندی کے کاری گروں کی تعریف کی جائے کہ انھوں نے اس صفائی سے دانت کے ٹکڑے چپکائے تھے کہ کہیں کوئی جھری، کوئی سانس نہ تھی۔ لگتا تھا کھپریلوں کو بنت کاری کے ذریعہ دروازے کے پلوں میں جڑ دیا گیا ہے۔ سارا کام اس صفائی سے ہوا تھا کہ بند دروازے پر دیوار ہی کا گمان ہوتا تھا یا پھر نقاشوں کی تعریف کی جائے۔ جنھوں نے ہاتھی دانت پر اس طرح اور ان رنگوں سے اُبھارے تھے کہ معلوم ہوتا تھا، یہ چینی کی کھپریلیں ہیں۔"(3)

یہ تفصیل لکڑی کی نفاست، ہاتھی کے دانتوں سے کاریگری کی پہچان اور پھر ایک ماہر بڑھئی کی طرح اس کیے گئے کام کی ہر چھوٹی چھوٹی چیز کا باریک بینی سے جائزہ اور ان کی تفصیل کا بیان، یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے ناول نگار خود ایک ماہر بڑھئی کی حیثیت سے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس ناول میں مذہبی رسوم و رواج کے متعلق بھی کافی تفصیل موجود ہے۔ وزیر خانم جب ناول کے اسٹیج پر نمودار ہوتی ہے۔ تو وہاں پر بزرگوں کی روایت کے مطابق وہ اپنے والد کے ساتھ عُرس مبارک کے دنوں میں مہرامام اشرف خواجہ قطب شاہ کی درگاہ سے واپسی کے سفر پر آتے ہوئے دکھائی گئی ہے اور یہیں سے مارسٹن اور وزیر بیگم پہلی مرتبہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوتے ہیں۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد یوسف سادہ کار اور اس کے اہل خانہ مذہبی خیالات رکھتے تھے:

"بڑی بیگم کو ایام صباہی سے اللہ رسول سے بے حد لگاؤ تھا۔ سات برس کے سن سے اس کی نماز قضا نہ ہوئی۔ نو سال کی ہوئی تو پابندی سے سے روزے رکھنے لگی۔ کلام مجید کی کئی سورتیں، بہت سی حدیث پاک، قصص الانبیاء کے کتنے ہی اجزاء سب اسے اَزبر تھے۔ پردے کی سخت پابند، کھیل تماشوں سے اسے کچھ لگاؤ نہ تھا۔ یہاں تک کہ بسنت کی بہار بھی نہ دیکھتی"

(4)

یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ناول نگار نے شعوری طور پر ناول میں مذہبی حوالوں کا ذکر کیا ہے۔ شمس الرّحمٰن فاروقی نے نہایت چابکدستی سے فاروقیوں کا حوالہ ڈاکٹر خلیل اصغر فاروقی کی زبانی دیا ہے۔ جس سے وہ قارئین پر اپنے فاروقی ہونے کو ثابت کرنے کے لیے، اپنے آباؤاجداد کے متعلق یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا تعلق موجودہ اعظم گڑھ ریاست کے فاروقیوں سے تھا۔ اسی طرح جب نواب وزیر شمس الدین خان کو پھانسی پر لٹکانے کے لیے 8 اکتوبر 1835 بروز پنج شنبہ 8 بجے شب پیش کیا جاتا ہے۔ اس وقت کے منظر کی جھلک کچھ یوں بیان کی گئی ہے۔

"تختہ دار پر چڑھنے سے پہلے شمس الدین احمد نے کلمۂ توحید اور پھر کلمۂ شہادت پڑھا۔ انھوں نے جلادوں سے سرگوشی کے لہجہ میں ان کی ذات اور مذہب پوچھا۔ جواب سُن کر 'جو اسی طرح زیرِ لب دیا گیا تھا' نواب شمس الدین احمد نے کہا۔ اللہ جانے میرے ڈھیر کو بھی مسلمانوں کے ہاتھ کی مٹی نصیب ہوگی کہ نہیں! اس لیے میں خود ہی اپنی مٹی کی دعا پڑھ لوں۔"

(5)

ناول کے ابتدائی حصے میں عام لوگوں کی زندگی کا طرزِ عمل، اس عہد کے تہذیبی ثقافتی، تخلیقی منظر نامے اور ملی جُلی تہذیب کے مظاہر کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

ناول میں اٹھارویں اور اُنیسویں صدی کے ہند اسلامی ماحول کو حقیقی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ ماحول جو خود ہماری اپنی کوتاہیوں، غلطیوں یا پھر انگریزوں کے سیاسی جبر کے باعث زوال کا شکار ہو گیا تھا۔ ناول میں تہذیب کے بارے میں وسیم جعفر 'جو وزیر خانم کی بیٹی صوفیہ مارسٹن بلیک کا پڑپوتا ہے' وہ اپنے آباؤاجداد کی تہذیب کے متعلق یوں سوچتا ہے۔

"کیا انھیں کوئی اندیشہ یا تصور تھا کہ ان کی تہذیب کی رِدا اس طرح پارہ پارہ ہونے والی ہے کہ ان کا نظامِ اقدار جلتے ہوئے ملک کا گاڑھا دھواں بن کر سمندر میں تحلیل ہو جائے گا اور اس سے جو انقطاع پیدا ہوگا، اس کی خلیج میں حافظے زائل ہو جائیں گے اور یادیں گُم ہو جائیں گی۔"(6)

یوں محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار ہمیں ماضی کی تہذیب و ثقافت اور معاشرت کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کا احساس دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے اپنے ماضی کا جائزہ لیتے ہوئے ذرا سوچیں کہ ہمارا ماضی کیسا تھا! اور آج ہم کہاں کھڑے ہیں۔ ماضی ایک بند کتاب کی مانند ہے، جسے ہم چاہتے ہوئے بھی کھولنے سے

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.3 2023

قاصر ہیں۔ لیکن اگر مسلسل کوشش، لگن اور دلچسپی سے اس کے اوراق کھولنے کی کوشش کی جائے تو یہ آہستہ آہستہ کھلنے لگتا ہے اور یوں پوری کتاب ماضی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے مصنف ماضی کی تہذیب وتاریخ سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے ہمیں ماضی کی کتاب کو کھول کر پڑھنے کی جانب راغب کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ تہذیب وتاریخ جو ہمارے حافظوں سے محو ہو چکی ہے۔

> ''آج ایسے گھرانوں کے نام اختصاصی مؤرخین ہی کو معلوم سہی، لیکن اپنے وقت میں یہ خانوادے علم اور فن، خاص کر شاعری، مصوری اور موسیقی کا گہوارہ تھے۔ ان کے کاغذات اور کتابیں اگر دیکھی جاتیں تو ہند اسلامی تہذیب کے نہ جانے کتنے گوہر بے بہا ان میں حضتہ اپنی موت کا انتظار کرتے ہوئے نظر آتے۔''(7)

مذکورہ بالا عبارت میں مصنف اٹھارویں اور انیسویں صدی کے عہد کی تاریخ و تہذیب اور ثقافت کی اس شاندار روایات کو تلاش کرنے کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو کبھی اپنی تابناکی کی مثال آپ تھی لیکن اب وقت کی ایک بھولی بسری داستان بن کر رہ گئی ہے۔ ناول میں مغلیہ سلطنت کی آخری چار پانچ دہائیوں کے بارے میں ذکر کرتے مصنف بتاتا ہے کہ اس عہد میں وزیر خانم اور وزیر خانم جیسی دوسری عورتیں معاشرے میں ایک نہایت اہم اور فعال طبقہ کی حیثیت رکھتی تھیں اور انھیں نام نہاد تہذیب کا درجہ حاصل تھا یہ طبقہ ڈیرہ دارنیوں یا پھر طوائفوں میں شمار ہونے کی بجائے وہ مقام حاصل کر چکا تھا کہ اشرفیہ نے ایسی عورتوں کو طبقاتی سطح پر قدرے قبولیت کی سند سے نواز رکھا تھا لیکن ان خواتین کا وہ مقام ہر گز نہ تھا جو اشرفیہ کے ہاں نکاحی عورتوں کو حاصل ہوتا تھا، لیکن اس کے باوجود یہ عالم تھا کہ کسی خوش فہمی میں مبتلا یہ مخلوق کم و بیش ویسی ہی تمکنت کا اظہار کرتی دکھائی دیتی ہے جیسی نکاح میں آنے والی عورتوں کا مقدر ہوا کرتی تھی۔ حالانکہ ان عورتوں کے بطن سے پیدا ہونے والی اولادیں بھی وہ مقام حاصل نہ کر پاتی تھیں جو نکاحی عورتوں کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد کو حاصل ہوا کرتا تھا۔ البتہ ان بچوں کی تعلیم و تربیت عام شرفا کے بچوں جیسی ہی کی جاتی تھی۔ اس عہد میں محل سراؤں میں کئی کئی بیویوں اور کنیزوں کو بغیر نکاح کے رکھنا ایک معمولی معاشرتی فعل کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ صورتِ حال نہ صرف اس عہد کے رؤسا اور نوابوں کے ہاں دیکھنے کو ملتی ہے بلکہ انگریز حکومت کے تمام چھوٹے بڑے افسر اور ان کے کارندے سبھی اس معاشرتی صورتِ حال سے فیض یاب ہو رہے تھے۔

> ''ہر انگریز ایک نہیں بلکہ دو، چار، چھ ہندوستانی ''بیبیاں'' رکھتا تھا۔ طوائفوں اور اربابِ نشاط سے عارضی تعلق یا کبھی کبھی کا آنا جانا اس پر مستزاد تھا۔''(8)

بن نکاحی عورتوں کی اولاد اور حقوق کا معاملہ انگریزی قانون میں بھی یہی تھا کہ انہیں قانونی حق سے محروم رہنا پڑتا تھا انگریزوں کی نکاحی بیویاں بھی کچھ خاص دعویٰ کا حق نہ رکھتی تھیں۔ اسی طرح دہلی کے اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ جنرل ڈیوڈ اوچرلونی (Gen.David ochter Lony) کے حرم میں بھی گیارہ اور ربہ قبول بعضے تیرہ) ہندوستانی بیبیاں موجود تھیں۔ اور وہ اکثر ان بیبیوں کے ہمراہ ہاتھیوں کے جلوس میں ہوا خوری کے لیے نکلا کرتا تھا۔ اس ناول میں جہاں کہیں بھی انگریز حکمرانوں اور افسروں کا ذکر ملتا ہے تو ان کے بارے میں یہ مشہور اور عام سی بات تھی کہ جہاں یہ لوگ دوسری متعدد جنسی عیاشیوں میں مبتلا رہتے تھے وہاں ہندوستانی عورتوں کا بھی ایک بڑا طبقہ ان انگریز مردوں کے تصرف میں رہتا تھا۔

> ''اس کی چھ ساتھ بیبیاں تھیں اور متعدد امرد بھی اس کے معشوق تھے۔''(9)

مارسٹن بلیک سے وزیر خانم کی دو اولادیں تھیں ایک بیٹی صوفیہ، عرف مسیح جان عرف بادشاہ بیگم اور ایک بیٹا مارٹن بلیک عرف امیر مرزا۔ انگریزوں کو ہندوستانی عورتوں سے پیدا ہونے والی اولاد سے کوئی خاص لگاؤ نہ ہوتا تھا۔ وہ تو صرف یہ تعلق عیش پرستی کے لیے بناتے تھے۔

> ''مارسٹن بلیک ان انتظامات سے خوش تھا کہ اس طرح اس کی دلبستگی اور بستر کی زینت بننے کے لیے وزیر کی خدمات زیادہ آسانی سے مہیا ہو سکتی تھیں اور یوں بھی اسے بچوں سے کچھ خاص لگاؤ نہ تھا۔ ہاں تحفے تحائف اور مٹھائی ریوڑی کی حد تک وہ فیاض ضرور تھا۔''(10)

اس عہد کی یہ ایک بہت بڑی خامی بھی کہی جا سکتی ہے کہ نوابوں، صاحبِ اختیار ارباب اور بادشاہوں کا سلوک بھی عورتوں کے ساتھ یکساں نہ تھا۔ نوابوں اور بادشاہوں کے محل سراؤں میں بے شمار کنیزیں اور بیبیاں تھیں جن سے نہ تو نکاح کیا جاتا تھا اور نہ ہی ان کے بطن سے پیدا ہونے والی اولادوں کو وراثت کا حقدار ٹھہرایا جاتا تھا۔ وہ اپنی خوش قسمتی کے

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.3 2023

دنوں میں جو کچھ جمع کر لیتی تھیں وہی ان کا مقدر ہوتا تھا لیکن وزیر بیگم خوش قسمت تھی کہ نواب شمس الدین احمد خان نے اسے جائیداد کا اقبالہ لکھ دیا تھا۔ لیکن اس کے بیٹے نواب مرزا داغ دہلوی بھی اپنے باپ کی جائیداد کے حصے سے محروم رہتے ہیں۔ جس طرح شمس الدین احمد خان کی ماں سے اس کے باپ نے بعد میں نکاح توڑ ھوالیا تھا لیکن پھر بھی نواب شمس الدین احمد خان کے بھائیوں کو ہمیشہ ان پر فوقیت حاصل رہتی ہے۔

ناول میں انگریزوں کی مکاریوں، ان کی مسلمانوں کے لیے نفرت اور حقارت کو بھی دکھایا گیا ہے۔ کہ کس طرح پہلے وہ اپنی عیاریوں اور مکاریوں سے حکمرانی حاصل کرتے ہیں اور پھر ہندوستانیوں کو حقیر، چور، کمتر اور محکوم قوم سمجھتے ہوئے ایک غیر مہذب قوم کہتے ہیں اور ان کی زبان کا بھی مذاق اڑاتے ہیں۔ جس طرح مارسٹن بلیک بھی اکثر اپنے ملازموں سے ہندی زبان کو بگاڑ کر بولتا تھا۔ یہ رویہ وزیر خانم کو ناگوار گزرتا تھا۔ یہی وجہ ہے جب کبھی وہ ایسی خبر سنتی تھی کہ کسی ہندوستانی نے انگریزوں کو نقصان پہنچایا ہے تو وہ بہت خوش ہوتی تھی۔

> ''وہ کہنا چاہتی تھی کہ ہم اہلِ ہند تم فرنگیوں کو غاصب اور خائن اور غیر کفو تصور کرتے ہو۔۔۔۔ وزیر خانم کا سب سے بڑا دکھ یہ تھا کہ اسے مارسٹن بلیک اچھا بھی لگتا تھا اور اس کی قوم سے اسے اگر نفرت نہیں تو کراہت ضرور تھی۔''(11)

وزیر خانم کا کردار اس ناول میں اس شکست خوردہ تہذیب اور مسلمانوں کی دہلی میں حکمرانی یا بادشاہت کا استعارہ ہے جس کے پاس ہر چیز تھی دماغ بھی، حسن کے ساتھ علم سے خوب واقفیت بھی، زندگی گزارنے کے طریقے اور سیاست سے کام لینے کا ہنر بھی تھا۔ لیکن اس کے باوجود وزیر خانم کو شکست پر شکست اور بد نصیبی کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس طرح سلطنت دہلی کے زوال کے بعد بادشاہ کو جلاوطن کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح وزیر خانم کو بھی آخر پر محل سے نکال دیا جاتا ہے۔ اس ناول کے آخری پیرا میں جب وزیر خانم کو قلعہ معلیٰ سے نکلنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ اس موڑ پر در حقیقت ناول نگار مغلیہ خاندان اور وزیر بیگم میں ایک طرح کی ہم آہنگی دکھاتے ہوئے محسوس ہوتا ہے۔

> ''اگلے سن مغرب کے بعد قلعہ مبارک کے لاہوری دروزے سے ایک چھوٹا سا قافلہ باہر نکلا۔ ایک پالکی میں وزیر بیگم، ایک بیل پر اس کا اثاث الیث اور پالکی کے دائیں بائیں گھوڑوں پر نواب مرزا خاں اور خورشید س مرزا۔ دونوں کی پشت اور گردن تنی ہوئی تھی۔ محافظ خانے والوں نے روکنے کے لیے ہاتھ پھیلائے تو مرزا خورشید عالم نے ایک ایک مٹھی اٹھنیاں چونیاں دونوں طرف لٹائیں اور یوں ہی سر اٹھاتے ہوئے نکل گئے۔ ان کے چہرے ہر طرح کے تاثر سے عاری تھے لیکن پالکی کے بھاری پردوں کے پیچھے چادر میں لپٹی اور سر جھکائے بیٹھی ہوئی وزیر خانم کو کچھ نظر نہ آتا تھا۔'' (12)

شمس الرحمٰن فاروقی نے اس عہد کی تہذیب میں علم و ادب کے مقام و مرتبہ کو سمجھانے کے لیے چند ادبی و علمی شخصیات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ان میں مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ، امام بخش صہبائی، حکیم محمد احسن اللہ، شیخ محمد ابراہیم ذوق، جو بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار دہلی کے استاد تھے۔ ان کی وفات کے بعد مرزا غالب بادشاہ کے استاد مقرر ہوتے ہیں۔ ان سب علمی و ادبی شخصیات کے ذکر سے ناول میں ادبی فضا پیدا ہو گئی ہے۔ ناول نگار نے دہلی کے مشاعروں کی تفصیل میں استعمال ہونے والی زبان، نوابوں کے لباس، اندازِ نشست اور طرزِ کلام کو جس انداز میں بیان کیا ہے وہ اس دور کے دہلوی ادب اور معاشرت کی بھرپور عکاسی کرتا دکھائی دیتا ہے

> مرزا غالب، نواب مرزا داغ دہلوی کا استقبال اپنے بالا خانے میں خود کرتے ہیں جو کہ ایک قابلِ دید منظر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے دہلوی معاشرے میں فن اور ادب کی قدر و پذیرائی کا پتہ چلتا ہے۔ جب مشاعرے میں مرزا داغ دہلوی نے شعر پڑھا:
>
> رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کے یہ کہتے ہیں
> ادھر آتا ہے دیکھیں یا اُدھر پروانہ جاتا ہے
>
> تو مرزا غالب جیسا نامور شاعر بھی اس نو عمر شاعر کو داد دیتا ہے اور اس کا خود استقبال کرتا ہے۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.3 2023

''میرزا صاحب نے بے تاب ہو کر وہیں سے پکارا! بے اولمڈو! کہاں نکلے جاتے ہو۔ادھر تو آؤ میرے پاس آؤ!۔۔۔۔۔۔۔۔اماں تم ہی نواب مرزا ہو؟ بھائی شمس الدین کے بیٹے آؤ آؤ۔ میں تمہیں ہی ڈھونڈ رہا تھا۔انہوں نے نواب مرزا کا گال تھپتھپایا اور اسے اندر آجانے کا اشارہ کرتے ہوئے۔''(13)

اس عہد میں ادب اور ادب سے وابستہ لوگوں کی بہت قدر کی جاتی تھی۔ جہاں تک بادشاہِ وقت بھی انہیں سراہتے اور ان کی شاگردی اختیار کرتے تھے جیسا کہ مرزا فخر واور بہادر شاہ ظفر کے استاد ذوق تھے اور جب ذوق وفات پا گئے تو پھر بہادر شاہ ظفر نے مرزا غالب سے اصلاح لینا شروع کر دی تھی۔ یہ سب دہلی کی ادبی تہذیب و معاشرت کو دکھانے کے لیے پیش کیا گیا ہے۔اسی لیے تو ناول نگار ایک جگہ لکھتا ہے۔اہلِ ہند کی تہذیبی بنا ہی شاعری پر قائم ہے غرض اس ناول میں جہاں ایک طرف آخری عہد کی مٹتی ہوئی تہذیب و ثقافت کے حوالے سے معلومات حاصل ہوتی ہیں تو دوسری جانب اس کے سیاق سباق میں اس عہد کے ہندوستان کی تاریخ اور حقیقی کردار بھی نظر آتے ہیں۔تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ زمانہ مغلیہ عہدِ سلطنت،اٹھارویں اور انیسویں صدی کی زوال پذیر تہذیب کی داستان کو بیان کر رہا ہے۔

حوالہ جات

1 شمس الرحمٰن فاروقی،(2018ء)،کئی چاند تھے سرِ آسماں، کراچی، شہر زاد۔ص815
2 شمس الرحمٰن فاروقی،(2018ء)،کئی چاند تھے سرِ آسماں، کراچی، شہر زاد۔ص282-283
3 شمس الرحمٰن فاروقی،(2018ء)،کئی چاند تھے سرِ آسماں، کراچی، شہر زاد۔ص299
4 شمس الرحمٰن فاروقی،(2018ء)،کئی چاند تھے سرِ آسماں، کراچی، شہر زاد۔ ص161
5 احسن فاروقی،ڈاکٹر(1960ء)،شامِ اودھ، کراچی،سنگِ گراں اردو اکیڈمی۔ص7
6 شمس الرحمٰن فاروقی،(2018ء)،کئی چاند تھے سرِ آسماں، کراچی، شہر زاد۔ص21
7 ایضا":ص20
8 ایضا":ص171
9 ایضا":ص224
10 عبدالسلام،پروفیسر،(1973ء)،اردو ناول بیسویں صدی میں، کراچی،اردو اکیڈمی سندھ۔ص189
11 شمس الرحمٰن فاروقی،(2018ء)،کئی چاند تھے سرِ آسماں، کراچی، شہر زاد۔ص186
12 ایضا":ص813
13 ایضا":ص654،655